سیاسی تسلط ختم ہو جانے کے بعد بھی مادی افادیت نہ صرف محفوظ و مامون ہیں بلکہ بڑی آزادی کے ساتھ پھلتی پھولتی ہیں اور ہر وقت جارحانہ پیش قدمی پر تیار رہتی ہیں۔ جامعہ حنفیہ ٹرسٹ لائل پور سارے مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے دینی مدارس کا جائزہ لیا اور اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ یہ ادارے سخت نامساعد حالات میں بھی کس طرح اپنے فرض کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اور انگریز کی غلامی اور اس کی جباری اور تمہاری اپنی ساری سیاسی قوتوں اور حیلہ سازیوں کے باوجود انہیں مٹانے میں سخت ناکام ہوئی ہے۔

اس جائزہ[1] کے مطابق پورے مغربی پاکستان میں اس وقت ۶۷۱ دینی ادارے کام کر رہے ہیں اور یہ تعداد صرف بڑے بڑے دار العلوم اور ان مدارس عربیہ اسلامیہ پر مشتمل ہے جہاں درس نظامی یا کوئی اصلاح یافتہ دینی نصاب رائج ہے۔ محکمانہ مدارس اور ابتدائی مکاتب کو اس فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جائزہ کے مرتبین کی کوششوں کے باوجود اس امر کا پورا امکان موجود ہے کہ بہت سے دینی مدارس کا اندراج نہ ہو سکا ہو۔ اگر ایسے اداروں کی تعداد اس سے نصف مان لی جائے تو محتاط اندازہ کے مطابق اس وقت مغربی پاکستان میں ایک ہزار سے کچھ اوپر دینی مدارس خدا اور خدا کے رسول کا پیغام پھیلانے میں مصروف ہیں۔ یہ تعداد ہماری قومی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ایک ایسا خطہ جس میں تقریباً ساڑھے تین کروڑ انسان آباد ہوں، ان میں سے اگر صرف ایک کروڑ کو تعلیم حاصل کرنے کے قابل سمجھا جائے اور اس میں سے خواتین کی نصف تعداد نکال لی جائے تو ۵ ہزار نفوس کے لیے مدرسہ کا اوسط ایک نکلتا ہے۔

خواتین کے مدارس کا حال اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس وقت پورے

---

[1] کتاب کا پورا نام ہے جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ مغربی پاکستان اس کی قیمت دس روپے ہے اور یہ جامعہ حنفیہ ٹرسٹ لائل پور، یا جامعہ حنفیہ ٹرسٹ محمد نگر، علامہ اقبال روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

مغربی پاکستان میں بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے جو ادارے کام کر رہے ہیں اُن کی تعداد اس جائزہ کے فاضل مرتبین کے اندازہ کے مطابق کل اٹھارہ ہے۔ اگر ہم اس تعداد کو دوگنا بھی کرلیں تو پھر بھی سوا لاکھ خواتین کے لیے صرف ایک مدرسہ قائم ہے۔

مردوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے دینی اداروں کی یہ قلت انتہائی تشویشناک ہے اور مسلم قوم کی بے حسی پر دلالت کرتی ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ جس تعداد کو ہم بہت قلیل تیار ہے ہو وہ انگریزی مدارس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ انگریزی سکولز اور کالجز ہمارے قومی نقطۂ نظر سے تعلیمی ادارے نہیں بلکہ صنعت و حرفت کی دوکانیں ہیں ہم اپنے بچوں کو ان اداروں میں تعلیم و تربیت کے لیے نہیں بھیجتے بلکہ اس غرض سے انہیں وہاں داخل کراتے ہیں کہ وہ روٹی کمانے کے قابل ہو جائیں۔ ان درسگاہوں کی وہی حیثیت ہے جو منڈی، کارخانے یا کھیت کی ہوتی ہے۔ ان کے خطرناک اثرات کو اگر ہم فی الحال نظر انداز بھی کر دیں تو پھر بھی ان کا زیادہ سے زیادہ مصرف نوخیز نسل کو سرکاری ملازمت کے لیے تیار کرنا ہے۔ ہمارے اس ملک میں ۵ فیصد لوگ سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں میں اپنی روٹی کما رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان انگریزی مدارس کی بہت کم لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہے۔ عام اندازہ یہ ہے کہ ایک قوم کے تقریباً ایک تہائی افراد کماتے ہیں اور دو تہائی آبادی انہی کی کمائی پر انحصار کرتی ہے۔ اب اس ایک تہائی کا اگر پانچ فیصد معلوم کر لیا جائے تو پوری آبادی کے مقابلے میں اُن لوگوں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے جنہیں ان درسگاہوں کی فی الحقیقت ضرورت درپیش ہے۔

دینی تعلیم کی حیثیت اس سے کہیں مختلف ہے۔ یہ روٹی کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کی بنیاد اور اساس ہے اسی کے ذریعہ ہمارے اندر ایک ایسا رجحان یا اندازِ فکر پرورش پاتا ہے جو ہمیں سیرت و کردا

کے خاص سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اعتقادات و تصورات سے لیکر افعال و اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ہم دینی تعلیم کے محتاج ہیں چنانچہ ہم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے اور مرنے کا جذبہ موجود ہے اسی وقت تک ہم اس بات کو بھی جاننے کے خواہاں ہیں کہ ہمارے خدا اور اس کے رسول نے ہمیں کونسے احکام دیئے ہیں۔ زندگی کے کسی لمحہ میں ہم تعلیمات الٰہی سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اسی بنا کے لیے جس طرح ہم اس دنیا میں ہوا اور پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ شدید ضرورت ہمیں دینی تعلیم کی ہے پھر یہاں ہندوؤں کی طرح تقسیم کار کا اصول بھی نہیں چل سکتا کہ کچھ لوگ دینی تعلیم حاصل کر لیا کریں اور باقی ان مقدس اور تعلیم یافتہ" انسانوں کی خدمت اور چاکری کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ اسلام میں ہر انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے اور کوئی دوسرا اس کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے حصول کو ہر مسلمان مرد اور عورت کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔

محولہ بالا گزارشات کی روشنی میں جو شخص بھی ان دینی اداروں کا مطالعہ کریگا وہ خود بخود ان کی زندگی کے راز کو پا سکتا ہے۔ غیر ملکی سامراج نے ان درسگاہوں کے ساتھ جو سوتیلانہ سلوک کیا اور مسلمانوں کے امراء نے بالعموم ان کی طرف سے جو مجرمانہ تغافل برتا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن اس کے باوجود یہ محض تائید ایزدی سے آج تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا سرمایہ اخلاص ہے اور اسی کے بل بوتے پر وہ مصائب کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے ہیں حضرت مولانا قاسم علیہ الرحمہ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھتے ہوئے جو رہنما اصول اس مدرسہ یا اس نوعیت کے دوسرے مدارس کو چلانے کے لیے رقم فرمائے وہ اس حقیقت کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ توجہ الی اللہ کے سہارے اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور

کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگی"۔
مولانا علیہ الرحمہ نے سرکاری امداد اور امراء کی امداد کو بھی اس مقدس مشن کے لیے مضر قرار دیا ہے اور اس بات کی وصیت فرمائی ہے کہ تا حد المقدور ایسے لوگوں سے چندہ لیا جاتے۔ جنہیں اس چندہ کی ادائیگی سے ناموری یا شہرت مطلوب نہ ہو بلکہ وہ اس فرض کو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سرانجام دیں۔

جہاں ان مدارس کے چلانے میں یہ طرز فکر کارفرما ہو وہاں اساتذہ اور طلباء کے لیے معاشی خوشحالی اور فارغ البالی کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ جائزہ کے فاضل مرتب اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مدارس عربیہ کے اساتذہ کی مالی حالت عموماً غیر تسلی بخش ہے جہاں سرکاری محکموں اور مروجہ محکمانہ ہائی سکول اور کالجوں کے اساتذہ کی بھاری بھرکم تنخواہیں سینکڑوں اور ہزاروں تک ہیں وہاں علمائے حق نان شعیر پر گذارہ کر رہے ہیں۔ کالجوں میں لیکچراروں کی تنخواہیں اور الاؤنس تین صد کے قریب ہیں اور یونیورسٹی میں ریڈر اور پروفیسر آٹھ صد سے ہزار روپے تک پاتے ہیں۔ دوسری طرف دینی مدارس میں ایسے حضرات کی تعداد کم نہیں جو گھر سے کھا کر حسبۃً للہ درس دے رہے ہیں۔ اساتذہ میں متعدد ایسے حضرات بھی ہیں جو طلبا کی ضروریات کے کفیل بھی خود ہی ہیں۔ ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں کہ اساتذہ کرام خود ہی مدارس اور دارالعلوم چلا رہے ہیں۔ قوم سے چندے وصول کرتے ہیں، قرض حسنہ لیتے ہیں، غرض جیسے بن آتا ہے انتظام کرتے ہیں۔ گویا تعلیم و تدریس کے ساتھ مالی وسائل پیدا کرنا بھی انہی کا ذمہ ہے اور وہ کسی انتظامی مجلس یا انجمن کے رہین منت نہیں ہوتے۔

عام طور پر دینی مدارس کے اساتذہ کے مشاہرے بیس تیس روپے سے شروع ہو کر سو ڈیڑھ سو تک ہوتے ہیں۔ مشاہرے کے علاوہ نہ کوئی مہنگائی الاؤنس ہے نہ کارپوریشن الاؤنس

ان اصحاب کے لیے عموماً کوئی گریڈ بھی مقرر نہیں ہوتا۔ معدودے چند دار العلوم اور بڑے مدارس کے جلیل القدر اساتذہ کو ڈھائی پونے تین سو کا مشاہرہ ملتا ہے لیکن ایسے ادارے چند ہی ہیں۔ لاہور جیسے شہر میں ایک ادارے میں پندرہ بیس روپے ماہانہ وظیفہ پر اساتذہ تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی سے کیا بے نفسی اور فقر و غنا کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس مفلوک الحالی سے ان کے قلبی اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس صورتِ حال سے دس بیس انسان دوچار نہیں۔ اس جائزہ میں جن ۲۹۲ مدارس کے حالات درج ہیں اُن میں ۱۰۴۶ اساتذہ اس خدمت جلیلہ کو سرانجام دے رہے ہیں۔ خدا کے ان مخلص بندوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو غیر ملکی سندات رکھتے ہیں اور اپنے فن میں ماہرین کہلانے کے ہر طرح سے مستحق ہیں۔ پھر ان اساتذہ کرام کی ذہنی سطح اور تعلیمی استعداد بھی انگریزی مدارس کے معلّمین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے جائزہ کے مرتب فرماتے ہیں:

> "دینی مدارس کے طلبا، جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں ان کو پوری طرح شرح صدر حاصل ہوتی ہے جو کچھ آج خود پڑھتے ہیں کل ہی دوسروں کو بلا تکلف و تکلیف پڑھا سکتے ہیں۔ عام طور پر وہ اپنی مادر درسگاہ ہی میں بطور معلّم و مدرس تقرر حاصل کر لیتے ہیں اور نہایت کامیابی سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سرکاری اور محکمانہ نظام تعلیم کے فارغ التحصیل طلبہ کے سامنے نہ وہ احساس ہوتا ہے جو علمائے کرام کے دل میں ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں وہ شرح صدر حاصل ہوتی ہے جو علماء کو حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ سب کچھ بعینہٖ دوسروں کو پڑھا سکتے ہیں جو انہوں نے خود پڑھا ہوتا ہے۔ میٹرک پاس میٹرک کے طلبا کو ایف اے پاس ایف اے کے طلبہ کو اور بی اے پاس بی اے کی جماعت کو ہرگز نہیں پڑھا سکتے۔ الا ماشاء اللہ۔"

یہ تو ہیں مختصر الفاظ میں دینی مدارس کے روشن پہلو۔ لیکن صدیوں کے انحطاط نے ان کے اندر بعض ایسی خامیاں پیدا کر دی ہیں جن کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی چیز جو سارے علمائے دین

کے غور و فکر کی محتاج ہے۔ وہ دینی تعلیم کے مقصد کا تعین ہے۔ "جائزہ" کے فاضل مرتب نے ایک سوالنامہ کے ذریعہ مختلف مدارس کے اربابِ بست و کشاد سے دریافت کیا کہ اُن کے نزدیک دینی تعلیم کا تخیل و مقصود کیا ہے اور کیا مروجہ نصاب وہ تخیل و مقاصد پورے کر رہا ہے؛ یہ سوال ۵۹۶ مدارس کو روانہ کیا گیا ہے اور ان میں سے ۲۱۳ نے اس کا جواب تحریر کیا۔ ان کی بھاری اکثریت نے اپنا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعتِ دین قرار دیا ہے۔ باقی نے بھی الفاظ کی تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ قریب قریب اسی چیز کو اپنا مقصد ٹھہرایا ہے۔

لیکن ان سب کا منتہائے مقصود ایک ہی ہونے کے باوجود ان کے مابین باہمی رقابت اور سرپھٹول اور طلبہ کے اندر جو تنگ نظری اور تعصب پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ "اکثر اصحاب کے ذہن میں اشاعتِ دین کا تصور صرف اس حد تک ہے کہ مسلمانوں کے اندر مسائلِ دین کی اشاعت کی جائے یا باہم دوسرے مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کی تردید کی جائے۔ چنانچہ تین مدارس نے وضاحت سے اپنے مسلک کی وضاحت و اشاعت ہی کو مقصود و مطلوب بیان کیا۔ صرف ایک ادارہ کے منتظم نے غیر مسلموں میں تبلیغِ اسلام کو بطور مقصد پیش کیا۔ اور ایک دوسرے صاحب نے حفاظتِ دین کو مطمحِ نظر بیان فرمایا[1]۔"

فقہی مسلک کی تعلیم و تدریس بلاشبہ دینی تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے لیکن جس طرح اسے آج بنیاد بنا کر تعلیم کی پوری ترتیب الٹ دی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ فقہی مسائل میں تفقہ قرآن و سنت میں گہری بصیرت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن جب فقہ کو قرآن و سنت کے سمجھنے کا واحد ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر نقطۂ نظر بہت حد تک محدود ہو جاتا ہے اور تعلیماتِ الٰہی کے بہت سے گوشے کھل کر آنکھوں کے سامنے نہیں آتے۔ فقہ کی اہمیت و ضرورت بہرحال مسلّم لیکن دین میں اسے قرآن و سنت کے برابر مقام دینا ہرگز درست نہیں۔ آخر سوچیے کہ ہمارے اسلاف میں فقہی اختلافات کے معاملے میں اتنی سختی اور شدت کیوں نہ تھی اور آج ہمارے درمیان جو شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اس کی وجہ صرف یہی تو ہے کہ فقہ کو جس انداز سے ہمارے مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے اُس میں کوئی خامی ہے۔

دینی مدارس میں بعض اصحاب علم صرف، نحو اور معانی میں غرق ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی علم ہے۔ ایسے اہلِ علم کو نصیحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا:۔

[1] جائزہ

"یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی آیتِ محکم کا نام ہے یا سنتِ ثابتہ ——— جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے مثلاً صرف نحو وغیرہ ان کو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو۔ علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو"

ہمارے ہاں درسِ نظامی میں شمولہ بعض کتابیں ——— خصوصاً فلسفہ، منطق اور علم الکلام ——— اس قدر قدیم ہیں کہ وہ اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ رفتارِ زمانہ نے فلسفہ، معیشت، معاشرت، سیاست اور تمدن میں بعض ایسی نئی الجھنیں پیدا کر دی ہیں جنہیں قدیم فلسفہ اور علم الکلام سلجھا نہیں سکتا۔ ہمارے علماء اپنے علم و فضل کے باوجود نئے مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہماری نوخیز نسلیں خواہش و تمنا کے ہوتے ہوئے بھی علماء کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔ اس کی ایک وجہ تو سیاسی اور معاشرتی حالات کے تغیرات ہیں مگر دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کے مابین ذہنی طور پر اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ جب تک علماء اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش نہیں کریں گے، وہ آنیوالی نسلوں کے دلوں میں اسلام کے لیے قربانی اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ انہیں اس کام کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔

مگر اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر اصلاحِ نصاب کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ مروجہ نصاب میں فلسفہ اور منطق کی پرانی کتابوں کو نکال کر اسی موضوع کی چند نئی کتب شامل کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ یہ سارے علوم اپنی پشت پر مادی تحریکات کی قوت رکھتے ہیں جنہیں اس وقت قبولِ عام حاصل ہے۔ لوگ ان سے مرعوب و مغلوب ہیں۔ ناگزیر ضروری ہے کہ انہیں شاملِ نصاب کرنے سے پہلے ان کا طلسم توڑا جائے۔

مغربی علوم و فنون کا سحر توڑنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ ساحرانِ فرنگ نے اپنی جادو بیانی کے زور سے افکار و نظریات کے جو طلسمات بنا رکھے ہیں ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے خلاف بطور دلیل استعمال کیا جائے۔ مغربی تصورات میں اس قدر تضاد ہے کہ ایک چیز اگر ہمیں تائید میں ملتی ہے تو دوسری اس کی تردید کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر چونکہ مغرب اس وقت الہامی تعلیم سے یکسر بے نیاز ہو کر آگے بڑھ رہا ہے

اس لیے اس کے معتقدات میں کوئی ٹھہراؤ اور ثبات نہیں۔ وہ آج اگر ایک مسئلہ کے حق میں کہہ رہا ہے تو کل اس کے خلاف بیان کرنا شروع کر دیگا۔ صبح اگر اُس کی ایک رائے ہے تو شام کو وہ یکسر بدل جائے گی۔ اس بنا پر اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ مغربی افکار و تصورات کا پوری طرح جائزہ لیا جائے اور پھر قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی تردید ہو۔ یہ کام بڑا محنت طلب اور صبر آزما ہے اس میں قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں گی لیکن امتِ مسلمہ جب تک اسے کامیابی سے سر انجام نہیں دیتی اس وقت تک اس کے لیے نوخیز نسل کو الحاد سے بچانا ممکن نہیں۔ ہمیں اس وقت ان مغرب پرستوں کی ضرورت نہیں جو یورپ سے آئی ہوئی ہر بات کی قرآن پاک سے تائید کرنے کے درپے ہوں۔ یہ خدمتِ دین نہیں بلکہ تحریفِ دین ہے اور اس سے نہایت خطرناک نتائج پیدا ہونے کی توقع ہے۔

مغربی افکار و تصورات کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے اُن کے اندر اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو یہ کوئی خطرناک بات نہیں کیونکہ یورپ کا ہر ذہین نوجوان جانتا ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ میں تغیرات ہو سکتے ہیں اس لیے اُن کے نزدیک افکار کی تبدیلی اُن کے ایمان کو متزلزل نہیں کرتی لیکن ہمارے ہاں اگر یہ روش اختیار کر لی گئی تو پھر ایمان کی خیر نہیں۔ آج جن مغربی افکار کی تائید میں ہم قرآن پاک کو تکلفاً گواہ بنا رہے ہیں کل اگر وہ بدل گئے یا اُن کی خامیاں سطح پر آجانے کے بعد لوگوں نے انہیں ترک کر دیا تو اس "مقدس گواہ" کا جو حشر ہوگا اس کا اندازہ ہر صاحبِ عقل بآسانی کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ روش سرے سے ہی غلط ہے اور اسے کم از کم دینی مدارس کے اندر اختیار نہ کرنا چاہیے۔ ہم آج مغرب پرست مسلم مفکرین کی خدمات کے محتاج نہیں بلکہ کسی غزالی کے منتظر ہیں جو اپنی قوت فکر و عمل سے مغرب کا طلسم توڑ سکے۔

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۳)

اور اہلِ[۸۰] کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے[۸۱] — سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے

۸۰؎ واضح رہے کہ آگے چل کر اسی سورہ میں ہجرت کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اُس وقت حبش ہی ایک ایسا مامن تھا جہاں مسلمان ہجرت کر کے جا سکتے تھے۔ اور حبش پر اُس زمانے میں عیسائیوں کا غلبہ تھا۔ اس لیے ان آیات میں مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو ان سے دین کے معاملہ میں بحث و کلام کا کیا انداز اختیار کریں۔

۸۱؎ یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہیے تا کہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ — دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور